قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلۂ

التبلیغ

کا

ستائیسواں و اٹھائیسواں وعظ مسمّٰی بہ

عود العید

و

عود العید

منجملہ ارشادات حضرت قبلہ و کعبہ ام حکیم الامۃ مرشدی و مولائی حافظ شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی

حسب فرمائش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون

ماہ جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۲ ہجری میں

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک اشرف المطابع تھانہ بھون کے اہتمام سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عود العید

این	متی	کم	کیف	ماذا	لم	من رای و شاہد	من ضبط	کم المستمعون	الاستنادات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	[illegible]	کیا مضمون تھا	کس وجہ	[illegible]	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	تصریحات
[illegible]	۲۹ رمضان ۱۳۵۰ھ	۲ گھنٹہ ۵ منٹ	[illegible]	رمضان و عید [illegible]	.	[illegible]	[illegible]	۳۰۰	عود العید [illegible]

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ و نستغفرہ و نومن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیأت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہ و نشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ و نشھد ان سیدنا و مولانا محمداً عبدہ و رسولہ اما بعد فقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم شھرا عید لا ینقصان رمضان وذوالحجۃ رواہ الشیخان عن ابی بکرۃ

یہ ایک ایسا وقت ہے جس کو دو زمانوں سے تعلق ہے رمضان سے اور عید سے

[illegible]

رمضان سے وقوع کا عید سے قرب کا یعنی آج رمضان کا دن ہے اس اعتبار سے رمضان سے تعلق ہے اور چونکہ عید کا زمانہ قریب ہے اس اعتبار سے عید سے تعلق ہے غرض دونوں اعتباروں سے دونوں مضمون مناسب وقت ہو سکتے ہیں عید کے اعتبار سے عید کا مضمون مناسب ہے اور رمضان کے اعتبار سے رمضان کا مضمون شایاں ہے خواہ اجتماعاً خواہ انفراداً اس وقت ایسا مضمون ذہن میں آیا کہ اوس میں دونوں پہلوؤں کی رعایت ہے اس وجہ سے نہایت ہی پر لطف مضمون ہو گیا۔

چونکہ آج آخر جمعہ ہے اور آخر جمعہ عادتاً مقتضے انتظار عید کو ہوا کرتا ہے اس لئے عید کی بابت مضمون مناسب ہے اور چونکہ تمام رمضان گذر گیا اور مجھے بیان کا اتفاق نہیں ہوا گو اکثر جمعہ کو اور حضرات کا بیان ہوتا رہا اس لئے یہ بھی مناسب ہے کہ رمضان کا بھی بیان میں لحاظ رکھوں پھر یہ کہ رمضان المبارک میں اگرچہ بیانات کا اتفاق ہوا مگر بعض مضامین بیان سے رہ بھی جاتے ہیں اس وجہ سے بھی اخیر جمعہ میں رمضان کا بیان ملحوظ رہنا مناسب ہے اور ہرچند کہ عادت عامہ رمضان اور عید کے فضائل بیان کرنے کی ہے اور ایک درجہ میں مناسب بھی ہے لیکن فضائل اکثر سُنے ہوئے ہیں اور معلوم ہیں لہذا ایسے مضامین کا بیان کرنا زیادہ مناسب ہے جن سے کان کم آشنا یا نا آشنا ہیں سو اس وقت ایسا ہی مضمون بیان ہو گا۔

قبل ازیں کہ میں یہ بیان کروں کہ وہ کیا مضمون ہو گا ترجمہ حدیث کا کر دینا مناسب سمجھتا ہوں ترجمہ یہ ہے کہ دو مہینہ عید کے ہیں کم نہیں ہوتے ایک رمضان اور دوسرا ذوالحجہ اب یہ سمجھنا چاہئے کہ کم نہ ہونے سے کیا مراد ہے ظاہراً مہینہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں یعنی کم اور زیادہ خود شریعت میں بھی دونوں قسم کا اعتبار کیا ہے بعض حسابوں میں تو ۳۱-۳۲-۲۸ کا بھی اعتبار کیا ہے مگر شریعت مقدسہ نے صرف ۲۹-۳۰ کا اعتبار کیا ہے کیونکہ رویت ہلال دو ہی قسم پر ہے تیسری قسم پر واقع نہیں ہوتی اور دوسری محاسبین نے شمسی حساب لیا ہے شریعت نے اسکو اس لئے نہیں لیا کہ حساب شمسی محسوس

اور ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے مشکل ہے اور حساب قمری بالکل محسوس ہے اوس میں کسیکو انکار نہیں ہو سکتا ہر شخص چاند دیکھ سکتا ہے اور جس علم میں عام لوگ مشترک ہوں وہ یقیناً سہل ہوتا ہے اسی بنی کی سہولت کی وجہ سے حضور شریعت کی نسبت فخراً فرماتے ہیں السمعۃ السھلۃ البیضاء بیضاء میں اشارہ ہے سہولت کے مبنی کیطرف کہ سفید اور روشن ہے روشن سے مراد علم ہے یعنی اس شریعت کی بناء علم عام ہے اور سمعہ سہلہ میں عمل کی طرف اشارہ ہے یعنی مبنی کے اعتبار سے بھی سہل ہے غرض علماً بھی سہل ہے اور عملاً بھی اور اسی سہولت مبنی اور بنی کی وجہ شریعت کا حاصل حق تعالیٰ کی طرف سے ارادۂ رحمت ہے اسیواسطے ایسا قانون مقرر کیا اسیکو حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ولو انا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوا من دیارکم ما فعلوہ الا قلیل منھم یعنی اگر ہم فرض کرتے انپر یہ کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو تو بجز معدودے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی نہ بجالاتا۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ شریعت کا حاصل ارادہ رحمت ہے کیونکہ اگر اس میں دشواری ہوتی تو اسپر عامل کم ہوتے اور رحمت عامل ہی پر ہوتی ہے تو اس صورت میں تعلق رحمت کا کم لوگوں سے ہوتا اگر کوئی کہے کہ رحمت کا اقتضاء تو یہ تھا کہ تمام شرائع سہل ہوتے کیونکہ وہ بھی رحمت ہی رحمت ہیں حالانکہ ۔

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم یعنی ان لوگوں پر جو پہلے شرائع میں بوجھ اور طوق لدے ہوئے تھے پیغمبر ان کو دور کرتے ہیں اس سے ان شرائع کا سخت ہونا ظاہر ہے نیز دوسری آیات سے بھی احکام کا سخت ہونا ظاہر ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات ۔ یعنی یہود کے ان ہی بڑے بڑے جرائم کے سبب ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں نیز

ؒ بطور احکام مقصودہ کے کذا فی بیان القرآن ۱۲ جامع

حرام کر دیں۔ اس سے بھی اُن شرائع کا سخت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ تو جواب میں کہونگا کہ اصل یہ ہے کہ ؎

آسمان نسبت بہ عرش آمد فرود۔ گرچہ بس عالی ست پیش خاک تود

یعنی بعضے امور اضافیہ ہوتے ہیں اسیطرح دوسری شرائع کا سخت ہونا بمقابلہ اس شریعت کے ہے اُن لوگوں کے طبائع کے اعتبار سے سخت نہیں چنانچہ قرآن مجید میں ایک مفصل واقعہ موجود ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شخص مقتول ہو گیا تھا قاتل کا پتہ نہ چلتا تھا موسیٰ سے قوم نے دعا کی استدعا کی چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر حکم ہوا۔ ان اللہ یامرکم ان تذبحوا بقرۃ حق تعالیٰ حکم کرتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو یہود کو سمجھنا چاہئے تھا کہ حق تعالیٰ صاحب حکومت ہیں اور موسیٰ علیہ السلام نبی ہیں یہ حکم سُنکر تعمیل سے چارہ نہیں مگر بجائے اس کے کہ ذبح کرتے اور تعمیل امر کرتے چونکہ سخت مزاج تھے نرم مزاجی پاس کو نہ پھٹکی تھی اس لئے کہتے ہیں۔ اتتخذنا ھزوا کیا ہم سے دل لگی کرتے ہو حالانکہ جب موسیٰ علیہ السلام نبی تھے تو خود آپ ہی کا امر ذبح کے لئے کافی تھا مگر پھر بھی مخالفت و تکذیب کے خوف سے آپ نے اللہ کا نام بھی لیا کہ خدا تعالیٰ حکم فرماتے ہیں مگر پھر بھی اثر نہ ہوا بلکہ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو طبعاً نبی کیساتھ بہ نسبت خدا تعالیٰ کے اُمتی کو زیادہ تعلق ہوتا ہے کیونکہ وہ مشاہد ہے اور قاعدہ ہے کہ جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آہی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ عام طور سے حضور کا سا ادب خدا تعالیٰ کا نہیں کرتے اور اسیوجہ سے فرماتے ہیں ما غرک بربک الکریم۔ جیسے بعض معلم جو زدوکوب نہیں کرتے تو سلیم الطبع طلباء تو اس کی سبق لیکر اپنے کام کو بخوبی انجام دیدیتے ہیں مگر بدمعاش طلباء اس ڈھیل سے اور بھی کام چھوڑ بیٹھتے ہیں جس کا نتیجہ ایک دن یہ ہوتا ہے کہ معلم ایک دن سخت پکڑتا ہے اسیطرح حق تعالیٰ شانہ بدکاروں کو ڈھیل دیتے رہتے ہیں اور ایک ہی دن سخت پکڑ لیں گے۔

؎ تجھکو کس چیز نے تیرے رب کریم کی نسبت بھول میں ڈال رکھا ہے از بیان القرآن جامع ۱۲

چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ سنستدرجھم من حیث لا یعلمون یعنی جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں ہم اون کو بتدریج جہنم کی طرف لئے جا رہے ہیں اس طور پر کہ انکو خبر بھی نہیں۔

نیتر سد از ان کا یزد تعالے　　اگرچہ دیر گیرد سخت گیرد

مگر اسپر بھی اون کی جہالت دیکھئے کہ باوجودیکہ ایک نبی فرما رہے ہیں جنسے طبعاً شرمانا چاہئے تھا پھر اوس ارشاد کا خدا کی طرف منسوب ہونا خدا کا نام لیکر ظاہر کر رہے ہیں جس سے عقلاً ڈرنا چاہئے تھا مگر اوس کے جواب میں اُن لوگوں نے کیا کہا اتتخذنا ھزوا مطلب یہ کہ ذبح بقرہ اور احیاء میت میں کیا جوڑ کوئی ایسے پوچھے کہ احمق تمہیں جوڑ کی کیا خبر بتلاؤ پانی میں اور آگ کے بجھنے میں کیا جوڑ اگر کوئی صاحب کہیں کہ آگ کا پانی سے بجھنے کا یہ سبب ہے کہ آگ میں حرارت اور پانی میں برودت ہے اور پانی اپنی برودت کے سبب حرارت کو بجھا دیتا ہے میں دریافت کروں گا کہ برودت کا حرارت کے بجھانے سے کیا جوڑ بجز مشاہدہ کے اسی طرح سے کھانے کے پکنے اور آگ میں کیا جوڑ غرض یہ ہے کہ کسی چیز میں کچھ بھی جوڑ نہیں سب حق تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہیں جن چیزوں میں چاہیں جوڑ لگا دیں اور جن چیزوں کو چاہیں توڑ دیں واللہ العظیم تمام امور حقیقت کے اعتبار سے اتفاقی ہیں۔

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ ایک گانوں میں خون ہو گیا تھا قاتل نے لاش کو دیوار میں رکھکر چنوا دیا تحقیقات میں بیحد سعی کی گئی مگر کچھ پتہ نہ چلا ایک انسپکٹر جو تحقیقات میں کامل تھے اُن کے یہ خدمت سپرد ہوئی اب دیکھئے کس طریق سے پتہ چلا ہے اوس طریق کو سنکر بیساختہ کہہ اوٹھو گے کہ یہ سب امور حق تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اسباب کی طرف محض ظاہری نسبت ہے۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں　　مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

کوئی کسی علم میں کسی عمل میں کامل نہیں سب ناقص ہیں۔ چنانچہ باوجود مزید تحقیقات کے اون انسپکٹر کو بھی کوئی پتہ نہ چلا انسپکٹر نہایت پریشان صدر سے تاکید پر تاکید

اب دیکھئے کہ اتفاقیہ کیا سامان ہوتے ہیں گرمیوں کے دن تھے دھوپ سے پناہ لینے کے لئے انسپکٹر اسی دیوار کے سایہ میں ایک چارپائی پر آرام کرنے کو آبیٹھے تمازت آفتاب سے حرارت کا اثر لاش پر ہوا اور رطوبات بہکر نکلنے لگیں اور مکھیوں کا اجتماع ہوا انسپکٹر نے جب مکھیوں کی کثرت دیوار پر دیکھی فوراً دماغ میں یہ بات آئی اور ذہن دفعتہً اس جانب متوجہ ہوا کہ شاید یہ رطوبت اوس لاش کی ہو فوراً دیوار کھودواڈالی لاش برآمد ہوگئی بڑے نیکنام اور مشہور ہوئے۔ آپ بتلائیے کہ انسپکٹر صاحب کا کیا کمال ہے اور ذہن کا اس جانب متوجہ ہونا یہ کون سا اختیاری امر ہے واللہ ادنیٰ سے ادنیٰ مقدمہ کا نکالنا بڑے سے بڑی دانشمند کا بھی کام نہیں سب امور اتفاقی ہیں جنکو ہم اسباب عادی سمجھتے ہیں وہ بھی واقع میں اسباب اتفاقی ہیں۔

پس جب کسی سبب و مسبب میں جوڑ نہیں تو جس کو بنی اسرائیل سبب عادی کے خلاف سمجھ رہے تھے اور اوس کے نزدیک اوس میں کچھ جوڑ نہ تھا اوس میں بھی کسی قسم کے جوڑ کی ضرورت نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ اللہ میاں ہر چیز کے جوڑ کو بھی تبلادیں کوئی اللہ میاں کے ذمہ فرض نہیں اللہ میاں کا حکم ہے عمل کرو۔

چنانچہ بنی اسرائیل کو یہی حکم ہوا کہ ایک گائے ذبح کرکے اوس کا ایک عضو لے کر اوس مردہ کے مارد و بنی اسرائیل اس کا جواب دیتے ہیں اتتخذنا ھزوا کیا آپ ہمکو مسخرا بناتے ہیں جامع ۱۲)

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین یعنی نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں کہ احکام خداوندی میں تمسخر کرنے لگوں۔ اس تمسخر پر ایک حکایت یاد آئی۔

ایک عالم صاحب بڑے ظریف تھے اون سے کسی نے مسئلہ پوچھا کہ مٹی کی ہانڈی میں کتے نے منہ ڈالدیا اوسے کس صورت سے پاک کریں مولوی صاحب نے (ظرافت سے) جوابدیا کہ ارے جا دمڑی کی ہنڈیا پر مسئلے پوچھتا ہے ایک اور بزرگ نے مولوی صاحب کا یہ جواب سنکر کہلا کر بھیجا کہ اب آپ کی ظرافت اور گستاخی شریعت کے احکام میں بھی ہونے لگی

انہوں نے توبہ کی غرض موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔
اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین قوم بولی ادع لنا ربك یبین لنا ماھی
آپ درخواست کیجئے اپنے رب سے ہم سے بیان کردیں کہ اوس کے کیا اوصاف ہیں ہماری
حضور فرماتے ہیں لو ذبحوا ایۃ بقرۃ لاجزء تھم یعنی وہ جونسی بقرۃ بھی ذبح کر لیتے
مثلاً معمولی سی گائے کی قربانی کر لیتے تو کافی تھا حصول مقصود کے لئے مگر چونکہ سخت مزاج
تھے جب تک غذائے مناسب نہ ملے ماننے والے کب تھے اس غذائے مناسب پر ایک
گوار آدمی کا ایک لطیفہ یاد آیا ہے تو کثیفہ مگر محاورہ کے اعتبار سے لطیفہ کہدیا ہمارے
چھوٹے ماموں صاحب کے پاس ایک یہاں ہی کا باشندہ گنوار جنگل سے دوڑا ہوا آیا
ماموں صاحب رسہ کی کھڑکی میں بیٹھے تھے جو جنگل کی طرف کھلی تھی کھڑکی کے پاس کھڑا ہوکر
بولا ایک مصرعہ سمجھ میں آیا ہے اوس کا جوڑ لگا دو اور یہ مصرعہ پڑھا۔

مصرع سنو دوستو ہے عجب ماجرا

دوسرا سمجھ میں نہیں آیا جیسے اکبر بادشاہ کے یہاں مشاعرہ تھا فیضی بھی جا رہا تھا ایک گنوار
ملا اور فیضی سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو فیضی نے کہا کہ مشاعرہ میں بولا مشاعرہ کس کو
کہتے ہیں اُس نے کہا تم سے تک ملانے کو۔ کہنے لگا اب کے ہم بھی آویں گے اور تک
ملا کر لاویں گے چنانچہ اگلے ہفتہ میں آیا اور پھر فیضی سے ملا اور کہا کہ ایک مصرعہ تو میں نے
بنا لیا ہے مگر دوسرا نہیں بنتا تم بنا دو اور یہ مصرعہ پڑھا۔ مصرع املی کا پتہ سبج (سبز)
فیضی نے اوس پر مصرع لگا دیا مصرع الجد حطی ھنج (ہونز)
چنانچہ وہ گنوار مشاعرہ میں آیا اور اکبر بادشاہ کے سامنے مشاعرہ میں اوس نے وہی
شعر پڑھا اکبر نے کہا کہ پہلا مصرعہ تو بہت اچھا ہے مگر دوسرا واہیات ہے تو وہ گنوار فیضی
کی طرف اشارہ کرکے کیا کہتا ہے کہ یہاں اس کی ماں نے ایسا تیسا کرایا تھا اور پہلا
میرا ہے اسیطرح ہمارے ماموں صاحب کے پاس آکر اوس نے یہ مصرعہ پڑھکر دوسرا
بنوانا چاہا۔ مصرع سنو دوستو ہے عجب ماجرا۔
تو ماموں صاحب فی البدیہ کیا کہتے ہیں کہ مصرع کہ کہا یا تھا منڈوا ھگا باجرا۔ وہ خفا ہوکر

چلا گیا غذائے مناسب پر یہ بات یاد آگئی تھی اسیطرح بنی اسرائیل اپنے مزاج کی مناسب سخت حکم کے جویاں ہوئے اور سہل کاموں کی قدر نہ ہوئی منڈوی پر یاد آیا کہ سخت مزاج لوگوں کو گیہوں کی روٹی سے تسلی نہیں ہوتی اور یہاں سے راز معلوم ہوتا ہی اس حدیث کا کہ ما خیر رسول اللہ فی امرین الا اختار اھونہما یعنے آپ کو جب کسی کام کے دو طریقوں میں اختیار دیا جاتا تو آپ آسان کو اختیار فرماتے حالانکہ آپ کو تو مشکل بھی مشکل نہ تھا اور بعض لوگ ایسے موقعہ پر سخت طریق کو اختیار کرتے ہیں اور اس کو افضل سمجھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ لوگ طریق کو مقصود سمجھتے ہیں اور طریق کے ساتھ معاملہ مقصود کا کرتے ہیں حالانکہ طریق کی ساتھ معاملہ طریق ہی کا شایاں ہے مثلاً کوئی شخص یہاں جامع مسجد میں نماز کے لئے آئے اور وضو کی ضرورت ہو تو وضو کے دو طریق ہیں ایک یہ کہ اسی حوض میں وضو کرلے ایک یہ کہ جلال آباد جاوے اور وہاں کی حوض میں وضو کر کے آئے تو یقیناً کوئی زیادتی ثواب کی نہیں ہے بلکہ ناپسندیدہ ہوگا کیونکہ اس میں طریق کی ساتھ معاملہ مقصود کا کیا گیا اور اسی سے شریعت کی خوبی معلوم ہوتی ہے کہ اوس میں ہر چیز اپنے موقعہ پر ہے طریق کی ساتھ معاملہ طریق کا کیا جاتا ہے اور مقصود کی ساتھ معاملہ مقصود کا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نرمی سے وہ جاہل گائے کو ذبح کرنے لگے تھے وہ تو جب تک سختی نہ ہوتی ماننے والے نہ تھے کیونکہ وہ تو سختی کے عادی تھے اونہیں سہولت سے کیا سروکار تھا اسیطرح بعضے مشائخ بھی سخت سے سخت مجاہدہ کراتے ہیں اور اس طرح ہم لوگوں نے بھی شادی وغمی میں اپنے اوپر رسوم کا التزام کرکے اپنے کو سختی میں گرفتار کرلیا ہے شادی اور دعوتوں میں پلاؤ۔ زردے۔ فیرنی لازم کرکے اپنے کو سختی میں ڈال لیا ہے صرف تفاخر کے لئے مگر نتیجہ یہ ہے کہ اکثر لوگوں کو پسند ہی نہیں آتا اور اسلئے فخر بھی نصیب نہیں ہوتا چنانچہ ایک گنوار آدمی کے سامنے فیرنی رکھی گئی تھی وہ کیا کہتا ہے کہ یہ تھوک سا کے ہے (گیا ہی)۔

حاصل یہ ہے کہ اپنے اوپر سختی محض اس بنا پر کی جاتی ہے تاکہ بعد میں یہ کہا جاوے

کہ راجہ آدمی ہے ذی حوصلہ شخص ہے غرض اپنے ہاتھوں سختی میں پڑنا خدا تعالیٰ کی ناشکری ہے اسی طرح وہ لوگ چونکہ سخت مزاج تھے دل میں کہتے ہوں گے کہ اس معمولی گائے میں یہ خاصیت مردے کو گویا کرنے کی ہے نہیں وہ گائے اور ہی قسم کی ہوگی جیسے کسی گنوار نے کبلہ گائے کو نئی قسم کی گائے سمجھا تھا۔

حکایت یہ ہی کہ ایک چودھری صاحب کسی تحصیلدار کے یہاں آئے تحصیلدار نے کہا کہ ہمارے قبلہ گاہی صاحب تشریف لائے ہیں اس لئے ہمکو اس وقت فرصت نہیں وہ چودھری صاحب اٹھکر چلے گئے اور اپنے لڑکوں میں بیان کیا کہ تحصیلدار کے یہاں کبلہ گائے آئی ہی لڑکے شوق میں اوٹھکر دیکھنے چلے اور چونکہ احتمال تھا کہ شاید کوئی حملہ آور گائے ہو اسلئے لٹھ بھی لے لئے غرض سب لوگ جمع ہوکر لٹھ لیکر تحصیلدار کے یہاں آئے تحصیلدار دیکھکر سمجھے کہ شاید چودھری جی خفا ہوگئے پوچھا کہ چودھری صاحب کدہر آئے چودھری جی نے کہا نہیں یہ لونڈے کبلہ گائے دیکھنے آئے ہیں تحصیلدار نے کہا لاحول ولا قوۃ وہ تو ہمارے والد صاحب ہیں۔ چودھری جی بولے کہ پھر کبلہ گائے کبلہ گائے کیوں کہہ رہے تھے سیدھا یوں نہیں کہا کہ ہمارا باپو آیا ہے بس بنی اسرائیل گویا اوس گائے کو کبلہ گائے سمجھی ہوں گے کہ کوئی نایاب چیز ہوگی کیونکہ معمولی گائے میں یہ خاصیت کیسی ہوسکتی ہے اس خاصیت کی گائے آسانی سے کب مل سکیگی اور یہ نہ سمجھے کہ خدا کے یہاں ہر شئے کے خزانے ہیں اگر کوئی دشواری چاہے تو دشواری بھی وہاں موجود ہے اور اگر کوئی سہولت چاہی تو سہولت بھی وہاں موجود ہے غرض دونوں قسم کے خزانے وہاں موجود ہیں، مگر عجیب رحمت ہی کہ وہاں کی دشواری بھی صرف صورتاً ہی قہر ہے ورنہ فی الواقع رحمت ہی۔

چنانچہ اعمال صالحہ کی صورت مشکل ہے مگر واقع اور حقیقت میں کوئی دشواری نہیں عمل کرنے سے سہولت معلوم ہوتی ہے۔

چنانچہ روزہ ہی کو دیکھہ لیجئے کہ کس قدر آسان ہے۔ امسال بہت ڈر تھا مگر ماشاءاللہ کیسے سہل ہوئے اگر آپ یہ کہیں کہ امسال تو بیحد گرمی کی شدت تھی اور اس وجہ سے

پیاس کا غلبہ ہوکر روزہ میں سختی محسوس ہوتی تھی تو آسان کہاں تھے تو اصل بات یہ ہے کہ وہ روزہ کی سختی نہ تھی اکثر یہ ہوا کہ ہم نے دنیا کا بلاضرورت زیادہ کام کیا یا مزدوری زیادہ کی باوجودیکہ ایک مدت معتدبہا کا کھانا ہمارے پاس موجود تھا تو یہ سختی اور دشواری کثرت کام کے سبب ہوئی اگر رمضان سے پیشتر کام کرکے رمضان کا بھی اسباب مہیا کرکے رکھ لیا جاوے تو دشواری کیوں ہو یا بار بار بعض لوگ نہلاتے ہیں اس سے بھی پریشانی ہوجاتی ہے۔ غرض عبادات حقیقت میں سہل ہیں ان میں دشواری صرف صورتاً ہے البتہ حقیقی قہر۔ زنا چوری شراب خواری بدنگاہی اور جمیع معاصی ہیں ہم نادان اس کا عکس سمجھتے ہیں کہ صورت قہر کو قہر سمجھتے ہیں اور معنی قہر کو قہر نہیں سمجھتے۔ ابراہیم علیہ السلام کے واسطے آگ صورت قہر تھی مگر واقع میں اس حکم سے وہ رحمت ہوگئی کہ قلنا یانار کونی بردا و سلما علی ابراھیم حدیث شریف میں ہے کہ دجال کی ساتھ ایک جنت ہوگی ایک دوزخ یعنی ایک باغ اور ایک آتشی خندق ہوگی اپنے مطیعین کو جنت میں اور مخالفین کو خندق میں ڈالیگا مگر واقع میں نہ وہ آگ آگ ہوگی اور نہ وہ جنت جنت ہوگی بلکہ عکس ہوگا صرف نظربندی ہوگی اسیطرح سے اس دنیا میں اکثر نظربندی ہورہی ہے صحیح عینک لگاؤ تاکہ یہ نظربندی دور ہو مگر تم نے یہ تو عینک ہی توڑدی لیکن حق تعالیٰ کے یہاں عینکوں کی کمی نہیں...... دوسری تیسری عینک لیلو حق تعالیٰ سے مانگ لو وہ مانگنے سے خفا نہیں ہوتی عینک دیں کے گو اس سے پہلے تم بہت سی عینکیں توڑ چکے ہو مگر وہاں سے تو یہ کہا جارہا ہے ؎

باز آ باز آہر آنچہ ہستی باز آ	صد بار گر تو بہ شکستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست	گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

غرض لطف و رحمت کبھی بصورت قہر بھی ہوتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

عسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم یعنی یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو مگر ہمکو چاہئے کہ صورت قہر کو قہر نہ سمجھا کریں اور ذرا عمل کرکے دیکھ لیا کریں بہرحال بنی اسرائیل کے جواب میں فرمایا گیا۔

انها بقرۃ لا فارض ولا بکر عوان بین ذلک فافعلوا ما تؤمرون

یعنی نہ بڈھی ہو نہ جوان دونوں عمروں کے وسط میں ہو سو اب کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہی مگر باوجود فافعلوا ما تؤمرون کے وہ مکرر تفتیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ۔ قالوا ادع لنا ربک یبین لنا ما لونها کہ اس کا رنگ کیسا ہو جواب دیا گیا۔ انها بقرۃ صفراء فاقع لونها وہ ایک زرد رنگ کی ہی جسکا رنگ تیز زرد ہو اسکی بعد پھر پہلے سوال کا اعادہ کیا کہ اوسکو ذرا وضاحت سے اور بیان کر دیجیے اور غنیمت ہے منہ سے ان شاء اللہ بھی نکل گیا خیر صبح کا بھولا شام کو آجاوے تو بھولا نہیں شمار نہیں۔ حدیث میں ہے لو لم یستثنوا لم یبین لہ مولانا رومی حکایت کنیزک میں ان شاء اللہ نہ کہنے کی خاصیت بیان فرماتے ہیں ؎

گر خدا خواہد نگفتند از بطر | پس خدا بنمود شان عجز بشر

یعنی ان شاء اللہ نہ کہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری باتیں اولٹی ہو گئیں اس طرح سے کہ

ہر چہ کردند از علاج واز دوا | رنج افزوں گشت و حاجت ناروا
از قضا سرکنگبیں صفرا فزود | روغن بادام خشکی می نمود
از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت | آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

غرض جو تدبیر کی اثر اس کے خلاف ہوا آگے ان شاء اللہ کہنے نہ کہنے کی حقیقت مقصودہ بیان فرماتے ہیں ؎

ترک استثناء مرادم قسوتی ست | نے ہمیں گفتن کہ عارض حالتیست
ای بسا ناوردہ استثنا بگفت | جان او با جان استثناست جفت

یعنی ان شاء اللہ کہنے نہ کہنے کے یہ معنی نہیں کہ زبان سے کہا یا نہیں کہا بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہی کہ استثناء دل میں ہو خدا پر بھروسہ ہو اور نہ کہنا اس کے خلاف ہی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ واذکر ربک اذا نسیت[ع] اور ظاہر ہے کہ ذکر عام ہے دل اور زبان دونوں کو پس ثابت ہو گیا

ع[ف] آیت میں حضور کو حکم ہے کہ آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجیے کہ میں اسکو مثلاً کل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملا دیا کیجیے یعنی ان شاء اللہ تعالیٰ وغیرہ بھی ساتھ کہہ دیا کیجیے اور جب آپ اتفاقاً ان شاء اللہ تعالیٰ کہنا بھول جاویں اور پھر کبھی یاد آوے تو اسوقت ان شاء اللہ تعالیٰ کہکر اپنے رب کا ذکر کیا کیجیے یعنے جب یاد آوے کہ لیا کیجیے ۱۲ منہ بیان القرآن جامع

کہ زبان ہی سے ضروری نہیں دل میں بھی کافی ہے اب اس سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ سلیمانؑ نے ایکبار اپنے لشکر سے خفا ہوکر فرمایا تھا کہ تم خدمت دین میں کوتاہی کرتے ہو میری ستّو بی بیاں ہیں سب سے مجامعت کرونگا تو ستّو سوار پیدا ہوں گے سب خدمت دین کریں گے مگر انشاء اللہ نہ کہا سب بیبیوں کے پاس گئے کسیکو حمل نہ ٹھیرا مگر صرف ایک بی بی کو کہ وہ بھی ادھورا ساقط ہوگیا اب سوال یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے قلب میں انشاء اللہ تھا یا نہیں اگر نہ تھا تو خلاف شان نبوت ہے اور اگر دل میں استثناء تھا تو نتیجہ عتاب کیوں ہوا جواب یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے قلب میں استثنا تھا اور یہ قلب میں ہونا و موقت کافی تھا جب کہ زبان سے کہنا یاد نہ آتا اور سلیمان علیہ السلام کو یاد آنا حدیث سے ثابت ہے کہ فرشتہ نے قلب میں یہ بات ڈالی مگر اتفاق سے یاد آنے پر بھی زبان سے نہیں کہا اس لئے عتاب ہوا۔

اب یہ بات رہی کہ طلاق میں انشاء اللہ متصلاً کہنا ابطال اثر کے لئے شرط ہے اور منفصلاً کہنا اس کے لئے کافی نہیں حالانکہ آیت اپنے عموم سے متصل اور منفصل دونوں کو شامل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عموم الفاظ میں وہ افراد داخل ہوتے ہیں جو مراد متکلم بھی ہوں اور جو مراد متکلم کی ہی نہ ہوں وہ عموم الفاظ میں داخل نہ ہوں گے اور آیت میں عموم باعتبار برکت کے ہے کہ وہ منفصلاً کہنے سے بھی حاصل ہو جاتی ہے ابطال و عدم ابطال اثر سے یہاں بحث ہی نہیں پس یہ عموم متکلم کی مراد ہی نہیں لہٰذا ابطال اثر میں عموم الفاظ سے استدلال ساقط ہوگا۔ غرض جب اون لوگوں نے استثنا کہہ لیا اور وہ لوگ ہوئے تو جواب ملا۔ انہا بقرۃ لا ذلول تثیر الارض ولا تسقی الحرث تب کہنے لگے کہ الآن جئت بالحق یہ بھی گستاخی سے خالی نہیں الآن کی قید کیسی اس قید سے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلے حق نہیں لائے تھے اس قید کے خلاف ادب ہونے پر ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مرتبہ بارش ہوئی ایک بزرگ کے منہ سے یہ نکلا کہ آج خوب موقعہ پر بارش ہوئی فوراً عتاب ہوا کہ بےموقعہ کب ہوئی تھی جو آج کی بارش کو موقعہ سے تبلایا جاتا ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ سخت مزاج تھے اس لئے سہولت کو پسند نہیں کیا سہل قانون کو اپنے

اور سخت کر لیا اور سہولت کی قدر نہ کی حضور کی طبیعت نرم بیحد تھی اس لئے حضور کے قوانین بھی نرم اور سہل تھے مبانی میں بھی سب کی شرکت کی وجہ سے سہولت تھی حالانکہ سہولت نعمت عظمیٰ ہے چنانچہ اس امت کے لئے جو احکام شروع ہوئے نہایت ہی سہل ہیں اور اسی سے مہینہ کا حساب بھی قمری رکھا گیا اور چاند کی رویت[۱] پر مبنی کیا گیا اور رویت کی اعتبار سے کبھی مہینہ ۲۹ کا ہوتا ہے کبھی ۳۰ کا اس سے مشتاق قرب کو یعنی جسکو قرب مقصود ہے یہ شبہ پڑ سکتا تھا کہ رمضان کا مہینہ کبھی تیس ۳۰ کا ہوگا۔ کبھی انتیس کا اور جب ۲۹ کا ہوگا تو ثواب بھی ایک دن کا کم ہوگا گو عام لوگوں کا تو یہ مقولہ ہے کہ عید کی تو جب خوشی جب چاند ہوا انتیس کا مگر خواص کو تو یہ فکر ہوگی کہ ثواب میں تو تیس ۳۰ کے اعتبار سے کمی ہوگی اور ایسے خلجان قاصد قرب کو ہوا کرتے ہیں کہ ذرا سی بھی کمی اس کے لئے سوہان روح ہو جاتی ہے۔ کما قال العارف الرومی رح

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود　　گر ز باغ دل خلالے کم بود

مگر یہ غموم اور ہموم اسی شخص کو ہوتے ہیں جو صرف اعمال ظاہرہ ہی کو ہی ذریعہ قرب سمجھتا ہو اور جو شخص یہ سمجھے کہ یہ غم و ہم بھی ذریعہ قرب ہے تو اسکو غم وہم میں رہنا بھی گوارا ہوگا اور عبدیت کی شان تو یہی ہے کہ اپنی کمی پر بھی اور راضی ہو نا اصل اس کی یہ ہے کہ اعمال کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی اگر ظاہری اعمال میں کسی عارض غیر اختیاری کے سبب کوتاہی ہوتی ہے تو اُس کے سبب باطنی عمل یعنی غم وہم بڑھ جاتا ہے اور مقصود یعنی قرب میں کمی نہیں آتی اس لئے خدا کے خاص بندے اپنے تمام اعمال کو خدا ہی کے سپرد کر دیتے ہیں یہی معنی ہیں بعض اکابر کے اُس قول کے کہ چونکہ وتر کے بعد کی دو رکعت حضور سے بیٹھکر ہی پڑھنا منقول ہیں اور قواعد شرعیہ سے بیٹھکر پڑھنے سے نصف ثواب کا استحقاق ہوتا ہے مگر چونکہ حضور نے بیٹھکر ہی پڑھی ہیں اس لئے ہمیں بیٹھکر پسند ہی خواہ ثواب نصف ملے یا پورا اور واقعہ میں اس شکل میں بھی ثواب پورا ہی ملیگا نصف تو نماز کا اور نصف تشبہ بالرسول کے قصد کا غرض ثواب ہی خواہ کسی وجہ سے ملا مقصود

---

[۱] خواہ رویت خود ہو یا شہادت کا مطابق قوانین شریعت علم ہو ۱۲ جامع

تو ملتا ہی اور یہی مطلب تھا حضرت حاجی صاحبؒ کے ارشاد کا جو ایک شخص کو فرمایا تھا قصہ یہ ہوا کہ حضرت کے یہاں ایک شخص بیمار آیا حرم میں نماز نہ ملنے کا رنج تھا اور اس حرمان پر وہ متاسف تھا۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ قرب کے دو طریق ہیں ایک حرم میں نماز پڑھنا اور ایک بیمار ہو کر حرم میں نہ جاسکنا اور اسپر صبر کرنا سو یہ بھی ایک طریق قرب ہے اور مقصود حقیقی صرف قرب ہی جو اس طریق سے بھی حاصل ہو گیا۔

حاصل یہ کہ کمی اعمال ظاہرہ کا تدارک اعمال باطنہ سے ہو جاتا ہی تو وہ کمی صرف دیکھنے ہی میں ہوتی ہی واقع میں نہیں ہوتی جیسا حدیث میں قصہ آیا ہے کہ چند صحابی حضور کے دولتخانہ پر حاضر ہوئے اور حضور کی ازواج مطہرات سے حضور کے اعمال کی بابتہ سوال کیا حضور کی ازواج نے حضور کے اعمال بیان کئے تو انہوں نے اون اعمال کو اپنے گمان سے کم سمجھا۔

چنانچہ حدیث میں ہے فکانہم تقالوھا اور یہ سمجھے کہ حضور کی یہ کمی نازیبا نہیں کیونکہ آپ محبوب ہیں اور محبوب کی کمی کمی نہیں شمار ہوتی اسکے بعد ایک بولا میں سوؤں گا نہیں رات بھر نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں نکاح نہ کرونگا۔ تیسرے نے کہا کہ میں برابر روزہ رکھونگا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے آئے اور سنکر ناخوش ہوئے اور فرمایا اما انا فاصوم وافطر واصلی وارقد واتزوج النساء وھذا من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی اور ظاہر ہے کہ حضور کے طریق کو کون کہہ سکتا ہے کہ ناقص تھا یقیناً کامل تھا خود آپکا طریق ہوتا ہی اوس کے راجح ہونے کی دلیل انی ہے کیونکہ اپنے پیارے کو اچھی ہی چیز دیا کرتے ہیں تو وہ تقلیل معنی تکثیر ہی ہے چنانچہ ایک ترجیح تو اس میں یہی ہے کہ وہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے برخلاف تکثیر کے کہ اوسپر ہمیشگی نہیں ہو سکتی پس اس تقلیل سے مقصود تکثیر ہے تو اس میں کثیر سے بھی ایک ترجیح ہے دوسری شیخ اکبر کہتے ہیں کہ سہولت رحمت کا مظہر حق ہے اور سختی قہر حق کا چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات تو طیبات کا حرام ہونا بوجہ قہر حق کے ہوا اور قہر حق کا سبب اون کا ظلم کرنا ہوا غرض سہولت میں رحمت

کا قرب ہو اور حدیث میں ہے سبقت رحمتی علی غضبی اس لئے احکام مسہلہ کو ترجیح ہوگی احکام شاقہ پر سبحان اللہ ۔ ہم خرما و ہم ثواب اسیکو کہتے ہیں اس کے غلبہ کے وقت رخصت پر عمل کرنا ہی من وجہ عزیمت ہوتا ہے سو عزیمت اوس وقت صورۃً افضل ہوگی اور رخصت معنًی دیکھئے فہم یہ ہے اور یہی وہ علم ہے جس سے یہ حضرات ممتاز ہیں محض تبحر کا نام علم نہیں ؎

شاہد آن نیست کہ موی و میانی دارد — بندہ طلعت آن باش کہ آنی دارد
نہ ہر کہ چہرہ بر افروخت دلبری داند — نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریک تر ز مو این جاست — نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

اور یہ وہ علوم ہیں کہ محض تقلیداً اون کا نقل کرنا خاذن الفاظ کو جائز نہیں اسیکی نسبت فرماتے ہیں ؎

حرف درویشان بدزدد مرد دوں — تا بہ پیش جاہلاں خواند فسون

اور محقق و مقلد کے اسی فرق کو فرماتے ہیں ؎

تو صاحب نفسی میان خاک چون مخور — کہ صاحب دل اگر زہری خورد آن انگبین باشد

اور اسیکو فرماتے ہیں ؎

لقمہ و نکتہ است کامل را حلال — تو نۂ کامل مخور می باش لال ۔

نیز فرماتے ہیں ؎

کار پاکان را قیاس از خود مگیر — گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر
جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد — کم کسی ز ابدال حق آگاہ شد
گفت اینک ما بشر ایشاں بشر — ما و ایشاں بستہ خوابیم و خور
این ندانستند ایشان از عمی — ہست فرقے درمیاں بے منتہا
این خورد گردد پلیدی زو جدا — واں خورد گردد ہمہ نور خدا

تو اپنے کو اونپر قیاس کرنا زیبا نہیں بلکہ ہمکو انکی ساتھہ یہ معاملہ کرنا چاہئے کہ ؎

قال را بگذار مرد حال شو — پیش مرد کاملے پامال شو

یعنی اپنے کو کیسے سپرد کردے اسی میں تمہاری خیر ہی پھر تمکو اپنی کسی مصلحت کے سوچنے کی بھی ضرورت نہ ہوگی اوس کی خود یہ حالت ہوگی کہ وہ بزبان حال..... کہیگا کہ ؎

من غم تو میخورم تو غم مخور ــــ بر تو من مشفق ترم از صد پدر

اور واقعی ایسوں کا اتباع بھی عجیب چیز ہے غرض اس طریق میں وجوہات شتی اور تجلیات مختلفہ میں کہیں رخصت کو غلبہ ہو جاتا ہی کہیں عزیمت کو مگر سہولت کی بھی ایک حد ہے اوس کا مدار تمہاری رائے پر نہیں۔ کیونکہ مشاہدہ ہبت سہولت کے عادی کی بھی قوت عملیہ باطل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مشہور ہی کہ مولویوں کے نوکر اور کسبیوں کے نوکر بیکار ہو جاتے ہیں کیونکہ دونوں مخدوم العالم ہیں سب اُن کی خدمت کو تیار ہو جاتے ہیں نوکروں کو کام کرنے کی نوبت بھی نہیں آتی اسلئے دونوں کے نوکر اپاہج ہو جاتی ہیں نیز مشاہدہ ہے کہ زیادہ آرام سے آدمی ایسا نکما ہو جاتا ہے کہ چلنا پھرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے لطف کی ساتھ زندگی نہیں گذر سکتی چنانچہ تذکرہ عرب میں لکھا ہی کہ ایک کثیر الاکل قلیل العقل آدمی پورا ایک اونٹ کھا گیا جب مجامعت کی قصد سے اپنی لونڈی کے پاس گیا تو قادر نہ ہوا اوسنے کہا کیف تصل الی وقد حال بیننا وبینک البعیر یہ لطف ہی زیادت طعام کا جسکو لوگ عیش و آرام سمجھتے ہیں اس حیلوتہ پر ایک اور حکایت یاد آئی کہ رڑکی میں دو واعظ وارد ہوئے جو کہا کہ شکم بڑہ جانے سے نکمے ہو گئے تھے باہم ملاقات ہوئے تو معانقہ کرنے لگے معانقہ میں گلے سے پہلے پیٹ سے پیٹ ملگیا ہمارے ایک ملا صاحب بڑے ظریف تھے کہا کہ مولانا یہ تو معانقہ نہ ہوا مباطنہ ہو گیا غرض زیادہ آرام طلبی بھی بری شی ہے وہ اس طریق میں بھی بیکار ہی ثابت ہوتا ہے اسی کو عارف شیرازی فرماتے ہیں کہ ؎

نازپروردہ تنعم نبرد راہ بدوست ــــ عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

یہی وجہ ہی کہ باوجودیکہ عیش پرست سب سے زیادہ یورپ کی اقوام ہے مگر چونکہ دنیا کی تجربہ کار عاقل ہیں اور جانتے ہیں کہ زیادہ عیش کا انجام کیا ہی اسلئے ریاضتیں نہیں چھوڑتی

اس لئے واجد علی شاہ کے عہدیوں کی طرح نکمّے نہیں ہوتے تو ریاضت سے انکو خود مصیبت مقصود نہیں مگر سہل اشیا کی سہولت اوسی وقت معلوم ہوتی ہے اور عیش جب ہی عیش ہے کہ نکمانہ ہوجائے کیونکہ نکماپن خود ایک مصیبت ہی بس اوس عیش کو عیش بنانے کے لئے ہی عقلا ریاضات اور مشقتیں گوارا کرتے ہیں پس سہولت بھی وہی مطلوب ہوئی جو حدود اعتدال کے اندر ہو تو حضور کی شریعت میں ایسی ہی سہولت کی رعایت ہے یعنی حفاظت اعتدال کی ساتھہ رہا یہ امر کہ تمام شرائع بوجہ احکام حکیم ہونے کے معتدل ہی ہیں پھر شریعت محمدیہ ہی کے لئے اعتدال کی کیا تخصیص ہے تو حقیقت یہ ہے کہ نفس اعتدال تو تمام شرائع میں مگر خود اعتدال کے مختلف افراد میں سے ہے۔

جو مبنی ہو

اعتدال کامل صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مقدسہ میں ہی کسی شریعت میں اعتدال حقیقی نہیں یہ ہی حقیقت اس سہولت کی جو اور شرائع میں نہیں ہے اللہ اکبر کیا عجیب بات ہی اس سہولت کے سبب بعض جگہ جو ظاہر میں کمی ہے وہ بھی واقع میں کمی نہیں اوس سے اور خوبی بڑہ گئی جیسے کسی شاعر نے زلف محبوب کی پریشانی کے بارہ میں کہا ہے ؎

نہ کچھ تیزی چلی باد صبا کی ‫ ‫ بگڑنے میں بھی زلف اوسکی بنا کی

دیکھا جاتا ہی کہ محبوب کا ہنسنا بھی اچھا معلوم ہوتا اور رونا بھی باوجودیکہ اوس میں مُنہ کی ہیئت بظاہر بگڑجاتی ہے بعض دفعہ خود ماں باپ بچوں کو چھیڑتے ہیں اور رولاتے ہیں کیونکہ ان کو بچہ کا ہنسنا اور رونا دونوں پسند آتے ہیں اور یہی راز ہے جو اللہ تعالی اپنے بندوں کو کسی پریشانی میں مبتلا فرما دیتے ہیں کہ اوس وقت کی انکی ادائیں ان کو اچھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ حضرات بھی چونکہ اس کو سمجھہ گئے ہیں وہ مضرت اور مسرت دونوں پر ایک درجہ میں راضی ہیں ؎

خوشا وقت شوریدگان غمش ‫ ‫ اگر ریش بینند د گر مرہمش
گدایانے از بادشاہی نفور ‫ ‫ بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم در کشند ‫ ‫ و گر تلخ بینند دم در کشند

زندہ کنی عطائے تو — در بکشی فدائی تو
جان شدہ مبتلائے تو — ہر چہ کنی رضائی تو
ناخوش تو خوش بود بر جان من — دل فدائی یار دل رنجان من

اسی طرح یہاں اوس کمی میں بھی جو کہ صورۃً کمی ہے کمال موجود ہے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھکر نماز پڑھنے میں بھی کامل اجر ہے کہ۔ مصرعہ

صاحبدل اگر زہری خورد آن انگبیں باشد

تم نے محبوبوں کو میلے کپڑوں میں سفید کپڑوں سے بھی اچھا پایا ہوگا اور خوب تو وہی ہے جو میلے کپڑوں میں بھی اچھا معلوم ہو سفید کپڑوں میں تو ہر شخص ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔

حسن الحضارۃ مجلوب بتطریتہ — وفی البداوۃ حسن غیر مجلوب
اصلی حسن میلے ہی کپڑوں میں نمودار ہوتا ہے

دل فریباں نباتی ہمہ زیور بستند — دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

اور یہ مضامین اون کے لئے ہیں جو محبت کا کچھ ذائقہ رکھتے ہیں اور غیر اہل سے تو اظہار مناسب بھی نہیں ہے

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی — بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

یہ راز ہے کہ حضور کی رخصت بھی عزیمت ہے غرض ۲۹ کا رمضان ہونے میں منشاء شبہ کا عمل کی کمی تھی کہ جب چاند انتیس کا ہوا تو ایک روزہ کا ثواب کم ہو گیا ہوگا اسی طرح ذی الحجہ میں بھی یہ شبہ پڑا کہ ذی الحجہ میں یکم سے ۹ تک روزہ مسنون ہیں اگر کبھی ایسا اتفاق ہو جاوے کہ ہم نے تیس کا چاند سمجھکر یکم ذی الحجہ سے روزہ رکھنا شروع کیا اور باہر سے انتیس کی خبر آ گئی تو ظاہر ہے کہ اسوقت بجائے ۹ روزہ کے ۸ روزے ہوں گے تو یہاں بھی جس کو اعمال سے قرب مقصود ہوگا اوسکو خلجان کمی قرب کا ہو جاویگا اس لئے کہ دسویں کو تو روزہ رکھ نہیں سکتا اس لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شبہ کو جو کہ رمضان اور ذی الحجہ کے بارے میں واقع ہوا تھا اس حدیث سے رفع فرماتے ہیں اور اس حدیث کی اور بھی بعض تفسیریں کی گئی ہیں

سب سے بہتر یہی ہے جسکی تقریر ہوئی تو حضور ارشاد فرماتے ہیں شہرا عید لا ینقصان رمضان و ذو الحجہ، دو مہینہ عید کے ہیں جو کم نہیں ہوتے یہ مطلب نہیں کہ ان میں حساباً ایام کی کمی نہیں یہاں تمیز محذوف ہے تمیز دار سمجھ لیں گے یعنی ثواباً اور وہ تمیز حقیقت میں فاعل ہے تو مطلب یہ ہوا کہ لا ینقص ثوابھما یعنی خواہ مہینہ ۳۰ کا ہو یا ۲۹ کا ثواب دونوں حالتوں میں ۳۰ ہی کا ہوگا کم نہ ہوگا اسیطرح ۹ میں بھی ثواب ۹ کا ہوگا کم نہ ہوگا اور راز اس میں یہ ہے کہ ثواب کا مدار نیت ہے اور نیت ہماری یقیناً یہی ہے کہ اگر تیس کا چاند ہو تو تیس ہی رکھیں گے پس ہماری یہ آمادگی حکم میں زیادۃ فی الحساب کے ہے اور اس آمادگی کے مدار ہونے سے نیز ایک علمی فائدہ اور معلوم ہوا وہ یہ کہ شبہ رضا بالقضا اور دعا کے جمع نہ ہوسکنے کا جاتا رہا شبہ کی تقریر یہ ہے کہ ایک طرف تو دعا کی ترغیب ہے چنانچہ حضور فرماتے ہیں کہ الدعاء مخ العبادۃ اور دوسری طرف رضا بالقضاء کا امر ہے اور ظاہر ہے کہ دعا ایک معین شق ہی کی ہوگی تو اوس شق کا طلب کرنا دوسری شق سے گریز کرنے کو مستلزم ہے اور ممکن ہے کہ قضا اوس کے ساتھ متعلق ہوئی ہو تو اوس قضا پر یہ شخص راضی نہ ہوگا اور پس دعا اور رضا بالقضا جمع نہ ہوئے اس عدم اجتماع کا بعض اہل حال پر یہاں تک غلبہ ہوا کہ وہ دعا ہی سے تارک بلکہ کارہ ہوگئے ایسوں ہی کا حال بیان فرماتے ہیں کہ ؎

کفر باشد نزد شان کردن دعا | کای خدا از ما بگرداں ایں قضا

یعنی دعا کو ناپسندیدہ سمجھتے ہیں تاکہ رضاء بالقضا نہ فوت ہو اس راز سے یہ بھی اشکال جاتا رہا اور یہ ثابت ہوا کہ رضا بالقضا دعا کی ساتھ جمع ہوسکتی ہے حل یہ ہے کہ رضا بالقضاء کے معنی یہ ہیں کہ جو قضا واقع ہو میں اوس پر راضی ہوں اگر بیمار ہوں تو بیماری پر اور تندرست ہوں تو تندرستی پر اور دعا کے یہ معنی نہیں کہ مجھ سے اس قضا کو ضرور ہی ٹالدے بلکہ یہ معنی ہیں کہ میں تو اپنے علم اور حاجت کی وجہ سے فلاں مقصود کا طالب ہوں لیکن اگر واقع میں اس کے خلاف قضا جاری ہونے والی ہے تو میں اوس قضا پر ایسا ہی راضی ہوں جیسا اُس مطلوب پر راضی ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ عین اوس دعا کے وقت دوسری شق پر بھی آمادہ ہے اس آمادگی کے
بناء پر اوس کو راضی بالقضا کہا جاویگا یہ ہیں علوم اسلامیہ جن سے ارسطو اور جالینوس
بھی بے بہرہ ہیں غرض دعا اور قضا میں جو اشکال تھا وہ اس آمادگی ہی کے قاعدہ سے
رفع ہوا اسی طرح یہاں بھی باوجود انتیس ہونے کے وہ اسپر آمادہ ہے کہ اگر تیس ہوئی تو تیس
ہی رکھونگا پس اس آمادگی ہی کے سبب تیس ۳۰ کا ثواب ملیگا اگر کوئی شخص کہے کہ جب
انتیس کا بھی ثواب تیس ۳۰ کا ہی ملا تو انتیس ۲۹ اور تیس ۳۰ اجر اور ثواب میں برابر ہوئے
تو پھر فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ کا و من یعمل مثقال ذرۃ
شرا یرہ کے کیا معنی یعنی آیت یہ بتلارہی ہے کہ جس درجہ کی کوئی بھلائی برائی کرے
وہ اوسے دیکھیگا حالانکہ ۲۹ سے پس جب ۳۰ میں ایک یوم کی زیادتی ہے پھر برابر
ہونے میں یہ یوم زاید کہاں گیا کہ انتیس ۲۹ والے کو تیس ۳۰ والے کی برابر ثواب ملنے کے
یہ معنی ہیں کہ ۲۹ کا ثواب دیکر پھر ایک کا ثواب انعام میں دینگے جیسے کسیکی تنخواہ
انتیس ۲۹ روپیہ ہو اور اوس کو تیس دینا ہو تو انتیس ۲۹ روپیہ تو ضابطہ سے دینگے پھر
ایک انعام میں دیدینگے اور یرہ میں کم کی نفی ہے زیادتی کی نہیں پس یہ جو
فرمایا ہے کہ جو جس قدر کرے گا اوس کو دیکھیگا اسکا مطلب یہ ہے کہ اوس سے کم
نہ دیکھیگا ۔ الحمد للہ کہ شبہ کی تقریر کے بعد یہ جواب اسیوقت ذہن میں آیا شبہ خدا
پر توکل کرکے بیان کردیا تھا کہ جواب کا القاء کرنا اون کا کام ہے چنانچہ توکل کی برکت سے
جواب ذہن میں آگیا حاصل یہ کہ طالب قرب کو جو یہ خلجان کمی عمل کے تسبب کمی ثواب کا
ہوا تھا اوس کی اس طریق سے تسلی فرمادی یہ حدیث کا محل ہو گیا ۔

بنی اسرائیل اس سہولت کی قدر داں نہ تھی چنانچہ خدا کے رحمت سے ان کو بلا
محنت اور مشقت برداشت کئے کہانا ملتا تھا مگر انہوں نے اوس کو بھی پسند نہیں
کیا کہتی ہیں کہ لن نصبر علی طعام واحد کہ ہم سے ایک کہانے پر نہیں رہا جاتا
اگر وہ ایک کہانے پر صبر کرتے تو اُن کی آرزو کی غذائیں بھی اسی طرح بلا مشقت ملتیں اور
کچھ محنت نہ کرنا پڑتی مگر وہ تو بڑے جاہل تھے ہر موقع پر جہالت ہی کی باتیں کرتے رہتے تھے

حق تعالیٰ کا فضل ہے اس امت پر کہ احکام کا نہایت ہی ادب کرتے ہیں اب دو
باتیں بیان کرنا اور باقی ہیں اور یہی دونوں ایسی ہیں جن کا بیان اس وقت کے مناسب
ہے چنانچہ یہ وقت مجمع ہے رمضان اور عید کے زمانوں کا اور ان دو باتوں کو ان ہی
دو زمانوں سے تعلق ہے ایک کو عید سے ایک کو رمضان سے اس وجہ سے یہ دونوں
مضمون اس وقت دونوں کے مناسب ہیں وہ مضمون مجموعی طور پر یہ ہیں کہ اس حدیث میں شہر
اعید مبدل منہ ہے اور رمضان و ذوالحجہ بدل الکل ہے یا یوں کہئے کہ رمضان و ذوالحجہ سے
پیشتر ہما مقدر ہے اور جو کچھ بھی ہو بدل الکل مبدل منہ پر محمول ہوا کرتا ہے اسی طرح راجع
اور مرجع ایک ہوا کرتا ہے پس دونوں توجیہوں پر اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رمضان
اور ذی الحجہ دونوں عید کے مہینہ ہیں سو ذی الحجہ کا عید کا مہینہ ہونا تو ظاہر ہے لیکن رمضان
کو عید کا مہینہ کیوں کہا پس اس کے جواب ہی میں وہ دونوں مضمون جو درجہ لطائف میں ہیں
مستنبط ہوں گے مختلف پہلوؤں سے اور ان لطائف سے جہلاء صوفیہ کے حقائق مراد نہیں
کہ وہ حقائق ہی کو مقصود سمجھتے ہیں اور صورت کی نفی کرتے ہیں حالانکہ واقع میں صورتیں
بھی مقصود ہیں چنانچہ نماز کی ایک صورت ہے جسکی اقامت فرض ہے ایک اس کے معنے ہیں
یعنی ذکر تو یہ نہیں کہ ذکر پر اکتفا کر کے نماز چھوڑ دے اسی طرح میں جو حقیقت بیان کروں گا
کہ عید کی حقیقت رمضان ہے اور رمضان کی حقیقت عید اس کے یہ معنے نہیں کہ ان کے
اعمال کی صورت ترک کر دی جاوے اب میں ان دونوں مضمونوں کو بیان کرتا ہوں
بیان اوس کا یہ ہے کہ رمضان بنا بر بدل محمول ہوا علی الضمیر الراجع ہونے کے متحد ہے
عید کی ساتھ اور جب ایک محمول کا کسی موضوع پر حمل کریں تو یہ بھی جائز ہے کہ جو پہلے موضوع
تھا اوسی محمول اور جو محمول تھا اوسے موضوع بنا کر حمل کر دیں گو کہیں فرق عموم و خصوص
کا ہی ہو گا جیسے الانسان حیوان کہنا صحیح ہے تو الحیوان انسان کہنا بھی درست ہے۔
اسی طرح سے یہاں بھی دونوں حمل ٹھیک ہونگے العید رمضان بھی اور رمضان عیدٌ بھی
مطلب یہ ہے کہ عید رمضان ہے اور رمضان عید ہے یعنی لوگ تو رمضان کو عید کا مقابل
سمجھ رہے ہیں کہ رمضان منافی ہے عید کے اور واقع میں وہ عید ہے جن میں تم نے تقابل

ثابت کیا تھا اون میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتحاد ثابت کر رہے ہیں اسی طرح سے عید کو سمجھ لو کہ تم عید کو مقابل ومنافی رمضان کا خیال کر رہے ہو اور واقع میں وہ رمضان ہے دیکھئے اہل حقیقت نے کس طرح ظاہری دو منافیوں کو جمع کر دیا اسی لئے محققین کو جامع الاضداد کہا جاتا ہے سو یہ تضاد زعمی اور وہمی ہوتا ہے نہ کہ تضاد حقیقی پس محققین بھوک کو کہ رمضان کا حاصل ہے غنا سمجھتے ہیں جو کہ عید کا حاصل ہے کیونکہ بھوک سے جب کہ اعتدال کی ساتھ ہو کہ وہ رمضان میں حاصل ہے نورانیت پیدا ہوتی ہے جس سے ذکر میں یکسوئی و توجہ تام وحضور قرب میسر ہوتا ہے اور یہی غذائے حقیقی ہے اور اسی سے کہا گیا ہے

وذکرک للمشتاق خیر شراب   وکل شراب دونہ کسراب

اور اس کے غذا ہونے کا یہاں تک اثر ہوتا ہے کہ اوس کا ظہور اُن کے اجسام پر ہونے لگتا ہے چنانچہ ذکر سے ذاکرین کے بدن تک میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بات ایسی مسلم و حسی ہے کہ عورتوں کے زبان تک پر بھی آجاتی ہے کبھی عورتیں کسی صالح قلیل الغذاء کی نسبت کہتی ہیں کہ کیا کھاتے ہیں اللہ کے نور سے پیٹ بھر جاتا ہے اور اگر یہ امر سمجھ میں نہیں آتا تو کچھ دن کر کے دیکھ لو معلوم ہو جاویگا اور یہی وجہ ہے کہ حضور فرماتے ہیں المؤمن یاکل فی معاء واحدۃ والکافر یاکل فی سبعۃ امعاء اور راز خاص اسکا یہ ہے کہ حقیقت میں غذا روٹی نہیں بلکہ روح ہے جس سے قوت جسم میں بھی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو غذا قلیل الکیموس ہے اوس سے روح نہیں بنتی اسلئے اوس سے قوت بھی نہیں ہوتی اور روح ذکر اللہ سے بالخاصہ زیادہ پیدا ہوتی ہے اور روح جتنی زیادہ پیدا ہو گی طبیعت اُتنی ہی زیادہ قوی ہو گی اور اس کو کہاں تک سمجھایا جاوے عمل کر کے دیکھ لو اسی لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ الجوع طعام الصدیقین اور ایک ضد کا دوسری ضد کے لئے سبب بن جانا کچھ مستبعد نہیں حسیات میں بھی اسکے نظائر موجود ہیں دیکھئے اصل میں حرارت بھوک پیدا کرتی ہے اور برف باوجودیکہ مزاج کے اعتبار سے سرد ہے مگر بواسطہ انسداد مسامات کے گرمی پیدا کرتا ہے اور اس گرمی کی وجہ سے بھوک لگتی ہے تو یہاں اس برف کی صورت بارد ہے اور حقیقت حار ہے پس معلوم ہوا کہ ایک شی کی ایک صورت

ہوا کرتی ہے اور ایک حقیقت تو حقیقت کے اعتبار سے وہ شئ اپنے مقابل کے ساتھ متحد ہو سکتی ہے اور اسکو جو حقیقت کہا گیا وہ خاص اعتبار سے کہا گیا ہی باعتبار لغت کے نہیں کہا بلکہ یہ حقیقت صورۃ کا مقابل ہے پس حقیقت ایک باعتبار لغت کے ہوتی ہے اور ایک دوسرے اعتبار سے یعنی ایک شئ کی ایک حقیقت باعتبار معنی لغوی کے ہوتی ہے اور اوس شئے کی دوسری حقیقت باعتبار خاصیت واثر کے ہوتی ہے تو پہلی حقیقت تو مقابل کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی لیکن دوسری حقیقت مقابل کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے پس اس حقیقت کے دوسرے معنے کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہے کہ رمضان صورۃً رمضان ہے حقیقتاً عید ہے۔ غرض حدیث سے مستنبط ہوا کہ رمضان کی حقیقت عید ہے یعنی کھانا پینا ظاہر اگو متروک ہی مگر واقع میں کھانا اور پینا موجود ہے اسلئے کہ روح کو غذا ملتی ہی اور یہ پیشتر ثابت ہو چکا کہ اصل غذا وہی ہے جو روح کی غذا ہے ایک مضمون تو یہ ہوا دوسرا مضمون یہ ہے کہ عید واقع میں رمضان ہے اور اس جملہ میں بھی معنی حقیقی سے وہی مراد ہیں جو اوپر مذکور ہوئے پس اوس کے اعتبار سے مطلب یہ ہوا کہ عید وہ نہیں جس کو تم عید سمجھ رہے ہو کہ بس خوب کھاؤ پیو بلکہ وہ رمضان ہے کہ اوس میں نفس کی غذاؤں کو گو معاصی اور انہماک فی المباحات ہی ترک کئے رہو اور ان دونوں جملوں کے کہ رمضان عید ہی اور عید رمضان ہے یہ معنی نہیں کہ رمضان میں خوب کھاوے پیوے یا عید میں نہ کھاوے نہ پیوے بلکہ دو غلطیوں کا رفع کرنا منظور ہے وہ یہ ہے کہ اے مخاطب ہم رمضان میں مشقت شدیدہ کو مقصود سمجھکر اور عید میں توسع شدید کو مقصود سمجھکر کھانا پینا نہیں چھوڑاتے نہ حد و دسے آگے کھانے پینے کی اجازت دیتے ہیں حتیٰ کہ روزہ میں اگر ایک وقت کھانے کی ممانعت فرماتے ہیں تو دوسرے وقت اجازت دیتے ہیں بلکہ دوسری وقت کے کھانے کی نسبت تو حضور یہ ارشاد فرمائے ہیں للصائم فرحتان فرحۃ عند افطارہ و فرحۃ عند لقاء ربہ۔ جس سے طعام عند الافطار کی مطلوبیت و فضیلت معلوم ہوتی ہے جو اجازت سے بھی بڑھکر ہے تو اس کے اعتبار سے بھی نہ کھانا جو کہ موضوع لہ رمضان کا ہے ظاہری

عید بھی ہوگئی اور ظاہر بھی ہے کہ اگر روزہ نہ ہوتا تو یہ لطف شربت کا اور کباب کا کہاں آتا اور اسی کا ثمرہ ایک عید آخرت میں ہوگی جس کی نسبت ایک اور ارشاد فرماتے ہیں کلوا واشربوا ھنیئا بما اسلفتم فی الایام الخالیہ سو تکمیل عید معنوی کے لئے یہاں بھی دو غذائیں عطا ہوئی ایک ظاہری افطار کے وقت ایک باطنی یعنی توجہ الی اللہ و قرب اور خود اس کی خوشی کہ ہماری عبادت پوری ہوئی اور اس خوشی میں ایک اور ضمیمہ ہوا اضافہ تمام دن بھوکا رہنا ہے اس اعتقاد سے کہ ہم نے آج روزہ رکھا یہ بھی باطنی غذا ہے کیونکہ اگر کوئی روزہ توڑ دے گو بھوکا رہے تو افطار کے وقت وہ خوشی کبھی نہ ہوگی اور اس سب سے بڑھ کر وہ باطنی غذا ہے جس کا حضور نے خود پتہ بتا دیا اور فرمایا کہ فرحۃ عند لقائہ ربہ غرض ایک غذا کی فرحت اور ایک لقا کی فرحت تو رمضان گویا عید در عید ٹھہرا اور یہ لقاء حق وہ غذا کہ اس سے کبھی جی ہی نہ بھرے گا ؎

دلارام در بر دلارام جو ٭ لب از تشنگی خشک و بر طرف جوئے
نگویم کہ بر آب قادر نیستند ٭ کہ بر ساحل نیل مستسقی اند
یزیدک وجہہ حسنا ٭ اذا ما زدتہ نظرا

اور اس جی نہ بھرنے کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار ٭ گل چین بہار تو ز داماں گلہ دارد

اور دوسرا شاعر کہتا ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز دم درکش ٭ حسن این قصہ عشق ست در دفتر نمی گنجد
نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایان ٭ بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچنان باقی

الحاصل رمضان میں مطلقاً ترک غذا نہیں تو رمضان کی صورت میں جو مشقت عدم فہم حقیقت سے معلوم ہوتی تھی ایک جملہ اس کا علاج فرمایا اور دوسری غلطی عید کے متعلق محتمل تھی کہ یہ خیال کرکے کہ اب تو رمضان گذر گیا معاصی پر دلیر نہ ہو جاویں غیبت بدنگاہی نہ شروع کر دیں دوسرے جملہ میں اس کا علاج فرما دیا غرض مجموعہ جملتین سے خوف و رجا دونوں

کی تعلیم ہوگئی تنگی کے وقت جوکہ رمضان کی صورت ترک سے محتمل تھی توسع اور توسع کے وقت کی صورت عید سے محتمل تھے تنگی کی تعلیم ہوگی۔

الحاصل تنگی کا وسعت سے اور وسعت کا تنگی سے علاج فرمایا پس حدیث میں کس درجہ بلاغت ہوئی اور اس حقیقت کے استحضار سے مخاطب کی اصلاح دائمی ہوگئی اور جن کے نزدیک عید صرف صورت ہی اون کے نزدیک تو عید سال بھر میں صرف ایک ہی دفعہ آتی ہے اور جو حقیقت سمجھ گئے اون کے نزدیک عید ہر وقت عود کرتی ہے۔ عود عید پر مولانا کا قول ہے ؎

عادت یا عیدی الدنیا مرحبا نعم ما روحت یا ریح الصبا

یہ دوسرا مصرعہ اوس کے دوام کا قرینہ ہے کیونکہ ریح صبائے حقیقی دائمی ہے اس طرح جن کے نزدیک رمضان صرف صورت کا نام ہے وہ آج اوسکو رخصت کر رہے ہیں چنانچہ عید کے قریب جو آخر جمعہ رمضان ہوتا ہے اوس میں ایک خطبہ پڑھا جاتا ہے الوداع کا وہ اس مضمون کا ہوتا ہے اور ہم نے تو خود اس خطبہ ہی کو وداع کر دیا پس ہمارا رمضان بھی دائمی ہے (حضرت آخر جمعہ کو بھی بقیہ سال کے خطبوں میں سے ایک خطبہ پڑھ دیتے ہیں اور الوداع کا خطبہ نہیں پڑھتے جامع ۱۲) ایک ہمارے استاد اس الوداعی خطبہ پر فرمایا کرتے تھے کہ پھر رمضان کے آمد کے وقت مرحبا مرحبا کا خطبہ کیوں نہیں پڑھتے یہ کیا کہ آمد میں تو خوشی نہ تھی جانے پر رنج ہے اور میں اسی پر اور اضافہ کرتا ہوں کہ جیسے رمضان کی فضیلت ہے جسکی فوت پر تاسف ہے اسیطرح اور ازمنہ کی بھی تو فضیلت ہے ان میں بھی الفراق الفراق یا ذی الحجہ الفراق الفراق یا محرم الوداع الوداع یا شعبان پڑھنا چاہئے مطلب یہ کہ ذی الحجہ اور محرم اور شعبان کی بھی فضیلت وارد ہے اگر نفس فضیلت الوداع کی وجہ ہے تو ان مہینوں میں بالوداع کیوں نہیں کہتے حقیقت تو یہ ہے کہ اگر یہ فعل مطلوب ہوتا تو حضور کہیں تو ترغیب فرماتے حضور تو للصائم فرحتان میں افطار کیوقت فرحت فرما رہے ہیں اور رمضان کا اختتام یہ افطار کبیر ہے اور اس لئے وہ بھی محل فرحت ہے اور ہم کہتے ہیں کہ رنج کرو ہاں پیر کے روز کی بھی فضیلت آئی ہے اور بعض روایات سے رجب کی بھی فضیلت معلوم ہوتی ہے اگر آپ اور زمانوں

میں بھی جن کی فضیلت ماثور ہے اس قسم کا عملدرآمد کریں گے تب البتہ ہم آپکو خاص یہ الزام نہ دیں گے بعض لوگ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب تو جائز کہتے ہیں اور آپ ناجائز کہتے ہیں موٹا سا جواب یہ ہے کہ یہ کیا بات ہے کہ ان مولوی صاحب کے فتوے سے تو ہمارے فتوے میں شبہ پڑ گیا ہمارے فتوے سے اون کے فتوے میں شبہ کیوں نہیں پڑا ورنہ اون مولوی صاحب سے بھی تو کہو کہ تم تو جائز کہتے ہو فلاں شخص منع کرتا ہے ہم اس وقت سمجھتے کہ واقعی تحقیق مقصود ہے اب تو صاف وجہ اسکی یہ ہے کہ جس کا فتویٰ نفس کے موافق ہوا اُس میں صحیح سمجھ لیا جس کا نفس کے خلاف ہوا اسکو رد کر دیا سو یہ کوئی دین نہیں غرض رمضان اور عید دونوں دائم ہیں۔ اسیکو مولانا فرماتے ہیں ؎

عدت یا عیدی الینا مرحبا　　نعم ما روحت یا ریح الصبا

اور اسیکو ایک بزرگ فرماتے ہیں ؎

ای خواجہ چہ پرسی از شب قدر نشانی　　ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

میں نے بڑے کام کی بات تبلا دی ہے یہی وہ مضمون جسکی تبلانے کے لئے یہ حدیث تلاوت کی گئی اور عید اور رمضان دونوں کے مناسب ہے اور اس بیان سے یہ تسلی بھی مقصود ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اب تو رمضان المبارک جو فضیلت کے ایام تھے چلد ئے اب ان برکات کی حصول کی کیا صورت ہوگی ؎

کوئی نومیدی مرد کہ امید ہاست　　سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

اس امت پر رحمت کی ہر وقت تجلی ہے حضرت غوث اعظم فرماتے ہیں ؎

افلت شموس الاولین وشمسنا　　ابدا علی افق العلی لا تغرب۔

پھر اگر اس آفتاب میں بھی کسیکو راستہ نظر نہ آیا تو وہ اپنی فکر کرے غرض آفتاب بھی ہر وقت طالع اور عید بھی ہر وقت رائج اب ختم کرتا ہوں اور اس مضمون کا نام عود العید رکھتا ہوں اس شعر کی وجہ سے ؎

عدت یا عیدی الینا مرحبا ❊ نعم ما روحت یا ریح الصبا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور جلسہ ختم ہوا

تمہید وعظ عود العید

(بضم عین عود)

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ احقر مدعا طراز ہے کہ جس روز اس تقریر کے بیان کرنے کا ارادہ تھا اتفاق سے کوئی ضبط کرنیوالا نہ تھا اور باوجود گنجائش زمانہ کے بعض مشاغل کی تنگی تاخیر کی اجازت دیتی نہ تھی اس لئے خود احقر نے اوس کو قبل بیان بہت مختصر ضبط کرلیا اور وعظ کیوقت اوسیکو کسیقدر بسط کیساتھ بیان کردیا اجزاء ما بہ البسط چونکہ اصل تقریر کے درجہ میں ضروری نہ تھے اس لئے اُن کا ضبط نہ ہونا مضر نہیں سمجھا گیا بس اوسی تحریر شدہ تقریر کو داخل مواعظ کیا جاتا ہے گو اور وعظوں سے صورۃً یہ بہت چھوٹا ہوگا لیکن ماقلّ ودلّ کا مصداق ہونے سے معنًا یہ کسی سے چھوٹا نہیں۔

کتبہ

اشرف علی عفی عنہ

۲۶ ذی قعدہ ۱۳۳۵ھ مقام

تھانہ بھون

عود العید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیأت اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد ان سیدنا ومولانا محمداً عبدہ ورسولہ اما بعد فقد قال اللہ تعالیٰ۔۔۔ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوی منکم کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ھداکم وبشر المحسنین۔

اس آیت میں کچھ مضمون قربانی کے متعلق مذکور ہے قرب ذی الحجہ کے سبب اس بیان کو اختیار کیا جاتا ہے کہ سامعین ابھی سے اوس کے اہتمام کے لئے آمادہ ہو جاویں۔ حاصل اس آیت کا قربانی کی بعضی غایتوں اور حکمتوں کا بیان فرمانا ہے اور گو یہ آیت موقع ذکر حج میں وارد ہے مگر خود ان حکمتوں کے بیان میں تخصیص حج کی مقصود نہیں گو حج کو بھی شامل ہے اور حاصل ان حکمتوں کا دو امر ہیں ایک امر باطنی ایک امر ظاہری امر باطنی نیت تقرب و اخلاص ہے جسکو ایک عنوان عام یعنی تقویٰ سے تعبیر فرمایا ہے کہ یہ دونوں یعنی نیت تقرب و اخلاص اوس کے اعلیٰ شعبوں سے ہیں اور باطنی ہونا اس کا ظاہر ہے مشاہد بھی ہے کہ فعل قلب ہے اور حدیث میں بھی ہے ان التقویٰ ھھنا واشار الی صدرہ اس کی مقصودیت کو اوپر کی آیتوں میں تعظیم شعائر سے کہ وہ بھی امر مبطن ہے اور اس آیت میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے لن ینال اللہ لحومھا الخ اور امر ظاہری ذبح کے

وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا جس کو اوپر کی آیتوں میں لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام سے اور اس آیت میں لتکبروا اللہ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ امر ظاہری یعنی ذکر اسم اللہ اور تکبیر اللہ اوسی امر باطنی یعنی تعظیم بالقلب و نیت تقرب واخلاص کا ترجمان ہے یعنی اسی لئے موضوع ہے کہ اس سے اوسکا اظہار ہو پس ان میں باہم دال و مدلول کا سا تعلق ہے پس ان میں حقیقی اتحاد اور اعتباری تغائر ہے اس اعتبار سے یہ دونوں حکمتیں ایک ہی حکمت ہیں اور ہر چند کہ ظاہراً علی ما ھدٰکم مطلق ہدایت کو شامل ہے لیکن خصوصیت مقام و نقل عن اہل التفسیر سے اس کی تفسیر خاص یہ ہے علی ما ھدٰکم من الذبح للہ تعالیٰ جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اسبات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو یعنی ذبیحہ پر اللہ اکبر کہو کہ اوس نے تم کو اس فعل موجب تقرب کی توفیق دی چنانچہ اگر وہ توفیق نہ دیتے تو ممکن ہے کہ بعض کی طرح تم ذبح ہی میں شبہات نکالتے یا ذبح کرتے مگر غیر اللہ کے نام پر یا اللہ ہی کے نام پر ذبح کرتے مگر نیت درست نہ ہوتی یا تو بالکل اخلاص نہ ہوتا یا کامل نہ ہوتا جیسے بعض لوگ ردّی جانور ذبح کرتے ہیں جو علامت ہے محبت کی کمی کی اور جس قدر محبت کم ہوگی اوسیقدر اخلاص کم ہوتا ہے کیونکہ اوس میں آمیزش ہوگی غیر کی محبت کی اور اوس غیر کو من وجہ مقصود سمجھنے کی مثلاً مال اگر اسکو مقصود نہ ہوتا تو ردّی کیوں ڈھونڈتا غرض یہ عمل اخلاص کے ساتھ کرنا توفیق ہی پر موقوف ہے پس اس توفیق پر تم حق تعالیٰ کی دل سے بھی تعظیم کرو اور زبان سے بھی اللہ اکبر کہکر اوس کا اظہار کرو پس یہ تفسیر ہے علی ما ھدٰکم کی۔ اور اسی تعظیم و تکبیر کی مقصودیت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں دوسرے طرق سے یہ تکبیر مشروع ہوئی ہے چنانچہ ایک تو عید کا دوگانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک تو تکبیرات انتقالات مشترک تکبیریں ہیں یعنی جیسی اور نمازوں میں ہیں اور اُن کے علاوہ تکبیرات زائدہ بھی ہیں جن کا عدد ائمہ کے نزدیک مختلف ہے امام صاحب کے نزدیک چھ تکبیریں ہیں جو نماز کی گیارہ تکبیروں کے ساتھ ملکر سترہ ہوتی ہیں جو رکعات فرائض کے برابر ہونے سے ایک مہتم بالشان عدد ہے اور دوسرا طریق اس کی مشروعیت کا یہ ہوا

کہ یوم عرفہ کے شروع سے ایام تشریق کے خاتمہ تک ہر نماز کے بعد بآواز بلند تکبیر کہی جاتی ہے۔ تیسرا طریق یہ ہے کہ عیدگاہ کے رستہ میں بھی کہی جاتی ہے اور اس تکبیر کے اشتراک سے ذبح اور صلوٰۃ کا جو باہمی تناسب معلوم ہوتا ہے مولانا رومی کے ارشاد میں اسکی تصریح بھی ہے۔

معنی تکبیر اینست اے امیم | کائی خدا پیش تو ما قرباں شدیم
وقت ذبح اللہ اکبر میکنی | ہمچنیں در ذبح نفس کشتنی۔
گوی اللہ اکبر وایں شوم را | سر ببر تا وار ہد جان از عنا۔
تن چو اسمعیل و جاں ہمچوں خلیل | کرد جاں تکبیر بر جسم منیل۔
ہمچو اسمعیل پیشش سر بنہ | شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

اور اگر لتکبیر و االلہ کو جو کہ آیت میں مذکور ہے ان سب تکبیرات صلوتیہ و غیر صلوتیہ کے لئے عام لے لیا جاوے جیسا کہ واذکروا اللہ فی ایام معدودات میں ان ایام کے سب اذکار و تکبیرات بالاجماع مراد ہیں تو تقریر آیت کی اس طرح ہوگی کہ تسخیر انعام اس لئے ہوئی کہ ہم کو تکبیر مقصود ہے چنانچہ ہم نے دوسرے طرق سے اس تکبیر کو مشروع فرمایا ہے جو علامت ہے اس کے مقصود ہونے کی اور اس تسخیر للذبح سے یہ مقصو حاصل ہوتا ہے اس لئے اس مقصود کی تحصیل کے لئے ہم نے انعام کو مسخر کر دیا پس آیت ہی مشتمل ہو جاویگی ان ایام کی تمام طاعات کو قربانی کو بھی تکبیرات غیر صلوتیہ کو بھی اور صلوٰۃ کو بھی جیسا کہ اس کی ردیف یعنی عید الفطر کی نماز کو بعض مفسرین نے سورہ بقرہ کی آیت شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن الخ میں جو ایسا ہی ایک جملہ یعنی لتکبروا اللہ علی ما ھدلکم واقعہ ہے اوس کا مدلول تفسیری کہا ہے پس ادہر ان دونوں یوم کے بعض احکام کا اشتراک اور ادہر ان دونوں میں اس جملہ کا اشتراک اور پہر جملہ سورہ بقرہ کا مفسر بصلوٰۃ العید ہونا اس جملہ سورہ حج کے مشتمل بصلوٰۃ العید ہونے کو قریب کئے دیتا ہے پس اس تقریر پر یہ آیت مشتمل ہوگی ان ایام کی دو قسم کی طاعت کو ایک باطن جسکی یہ تعبیریں ہیں نیت تقرب و اخلاص و تعظیم بالقلب اور ایک ظاہر جسکی

یہ تعبیریں ہیں صلوٰۃ تکبیرات تسمیہ علی الذبیحہ پس سامعین کو ان ایام میں دونوں
امر کی رعایت ضروری ہے نہ صرف ظاہر پر کفایت کریں کہ قربانی اور نماز کا نام کرلیا اور
بس اور نہ مدعیان کاذب کی طرح نرے باطن پر کفایت کریں کہ اخلاص ہی اصل ہے اور بزعم اس
اصل کو لئے ہوئے ہیں کہ یہ اعتقاد نری گمراہی ہے وعظ روح الارواح اس جامعیت
کی ضرورت کے بیان میں قابل ملاحظہ ہے اور خود قرآن ہی کیسا اس میں واضح ہے
کہ آیت میں دونوں امر سے تنصیصاً تعرض ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم اور دونوں طاعتوں
کے جمع کی توفیق دے اب میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام عود العید رکھتا ہوں
اس لئے کہ عود کے دو معنی ہیں ایک خوشبوئے خاص دوسرے ساز خاص اور چونکہ یہ تقریر
مشتمل ہے دو طاعت کے بیان پر ایک ذبح جس میں اراقۃ دم ہوتا ہے اور یہ دم فی
سبیل اللہ ہے اور بعض دماء فی سبیل اللہ کی نسبت حدیث میں ہے اللون لون الدم
والریح ریح المسک پس اس دم ذبیحہ کو بھی مشابہت دم شہید کے سبب حکماً خوشبودار
قرار دے کر عود سوختنی سے تشبیہ دی گئی اور عود سے یہ مناسبت سمجھی گئی کہ ایک
تو عود کو آگ سے مناسبت ہے اور دم طحال وکبد ولحم ذبیحہ کو بھی بوجہ پکائے جانے کے
آگ سے تلبس ہے دوسرے اس عمل کی جزا جنت میں ہے اور جنت میں عود کا سلگنا
حدیثوں میں آیا ہے سو طاعت اراقہ کو تو عود کے ایک معنی سے مناسبت ہوئی دوسری
طاعت یعنی تکبیر صلوتیہ یا غیر صلوتیہ اس کو جہر کے سبب عود کے دوسرے معنے سے مناسبت
ہوئی دوسری طاعت یعنی تکبیر صلوتیہ یا غیر صلوتیہ اسکو جہر کے سبب عود کے دوسرے
معنے سے مناسبت ہے اس لئے ان معانی کی رعایت سے اس کا یہ نام مناسب ہوا نیز لفظی
لطافت اس نام میں یہ ہے کہ اس کے متصل والی عید الفطر کے متعلق جو بیان ہوا تھا اوس
بیان کا نام عود العید رکھا گیا ایک حرکت کی تبدیل کے بعد گویا وہی نام اس کا ہوگیا اور
اس میں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ عود تو آلات محرمہ سے ہے طاعت کو اوس سے تشبیہ دینا
خلاف ادب ہے بات یہ ہے کہ مجازات واستعارات وتشبیہات میں ایسی تنگی نہیں خود قرآن مجید
میں متاع کی مذمت ہے اور حدیث میں مرأۃ صالحہ کو خیر المتاع فرمایا گیا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا عید ہی کے متعلق ارشاد ہے لکل قوم عید و ھذا عیدنا ظاہر ہے کہ قوم کفار کی عید بمعنی لہو و لعب ہے تو ذوق لسانی میں ہذا عیدنا کا صاف مدلول یہ ہے کہ ہذا لعبنا تو مجازاً اسکو یوم اللعب کہہ دیا گیا اور حضرت علیؓ کا قول ہے ؎ السیف والخنجر ریحاننا - اف علی النرجس والآس
شرابنا من دم اعدائنا - وکاسنا جمجمة الراس - بہرحال یہ کوئی شبہ کی بات نہیں
بحمد اللہ اصل تقریر تو ختم ہو چکی اب ایک مختصر شبہ کا رفع کرنا باقی ہے جس پر مجلس ختم ہے وہ شبہ بھی ایسے شخص کو ہو گا جسنے میری تقریر حدیث سنت ابیکم ابراہیم کے متعلق جو ابھی برسوں کیرانہ میں ہوئی ہے جس کا نام میں نے سنت ابراہیم رکھا ہے سنی ہو گی یا بعد ضبط اوس کی نظر سے گذریگی اول میں اوس تقریر کا خلاصہ عرض کرتا ہوں پھر اوس سے جو شبہ ہو سکتا ہے اوس کو ظاہر کروں گا پھر اوس کا جواب دونگا وہ تقریر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے عرض کیا ما ھذہ الاضاحی یا رسول اللہ یعنی یہ قربانیاں کیا چیز ہیں آپ نے فرمایا سنة ابیکم ابراہیم سو حضرت نے اس میں یہ بیان کیا تھا کہ صحابہ نے قربانی کی حقیقت پوچھی تھی آپ نے حقیقت بیان فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سنت ہے ابراہیم علیہ السلام کی اور ظاہر ہے کہ سنت سے مراد ہر سنت تو ہے نہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کا ہر فعل تو قربانی نہیں ہے بلکہ مراد سنت خاصہ ہے پس جواب یہ ہوا کہ التضحیة سنة خاصة لابراھیم بس ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو حدیث سے ثابت ہے اب دیکھنا چاہئے کہ وہ سنت خاصہ کونسا فعل ہے سو قرآن میں جو اسکے متعلق قصہ مذکور ہے اس میں اُن کے دو فعل منقول ہیں ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش فدیہ اور ہر چند کہ سرسری نظر میں جو آپکا اخیر فعل ہے یعنی ذبح کبش وہ مصداق معلوم ہوتا ہے سنت ابراہیم کا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اس بناء پر کہ اصل مامور بہ ذبح ولد تھا یہی احق ہے سنت کے مصداق ہونیکا پس دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ سنة ابراھیم ذبح الولد جو قرآن سے ثابت ہے اور اس کے عدم وقوع کو مانع ارادہ نہ سمجھا جاوے کیونکہ ذبح بمعنی ذبح کردن جو کہ فعل اختیاری ہے وہ تو واقع ہوا البتہ اوس کا اثر مطاوع یعنی مذبوح شدن واقع نہیں ہوا تو ذبح پر عدم وقوع کا حکم ہی غلط ہے نیز انبیاء علیہم السلام کا خواب حق ہے اور وحی میں غلط کا احتمال نہیں اور خواب میں انی اذبحک نص ہے تو ضرور ذبح کو واقع کہا جاویگا۔ پس جب یہ اوسکا مصداق ہوا تو اب عبارت جواب کی یہ ہوئی کہ التضحیة ذبح الولد اور ظاہر ہے کہ یہ حمل ظاہر صحیح نہیں اور نتیجہ ضروری ہے کیونکہ دونوں مقدمے صحیح تو نتیجہ ضرور صحیح ہوگا یعنی التضحیة ذبح الولد اور اسکو نتیجہ بالمعنی الاصطلاحی نہ سمجھا جاوے کیونکہ وہ لازم ہوتا ہے صغریٰ اور کبریٰ کو اور یہاں سنة ابراھیم ذبح الولد جو مقدمہ ثانیہ ہے کلیہ نہیں مگر مدعا کا اثبات اوسکے کبریٰ ہونے کے طور پر کیا ہی نہیں گیا بلکہ تقریر کی توجیہ یہ ہے کہ سنت سے مراد جب ذبح الولد ہے تو جملہ التضحیة سنة ابراہیم میں بجائے لفظ سنت ابراہیم کے لفظ ذبح الولد رکھ دو تو عبارت یہ بن جاویگی کہ التضحیة ذبح الولد اور یہی مدعا تھا غرض جب دونوں مقدمے صحیح ہیں تو مدعا بھی صحیح ہونا لازم ہے

پس اسکو سمجھنا چاہئے یہاں موضوع ومحمول میں دو دو احتمال ہونے سے کل چار احتمال اس حمل میں ہوسکتے ہیں ایک صورۃ التضحیۃ صورۃ ذبح الولد دوسرا روح التضحیۃ روح ذبح الولد تیسرا صورۃ التضحیۃ روح ذبح الولد چوتھا روح التضحیۃ صورۃ ذبح الولد اور بجز ثانی کے سب کا بطلان ظاہر ہے پس ثانی متعین ہوگیا یعنی ان دونوں فعل کی روح اور لب اور مغز ایک ہے مطلب یہ کہ تضحیہ کی جو حقیقت اور مغز ہے وہ وہی ہے جو ذبح ولد کی حقیقت اور مغز ہے اب یہ بات رہ گئی کہ وہ مغز ذبح الولد کا کیا ہے کہ اسی کو روح تضحیہ کہا جاویگا سو وہ مغز ذبح الولد کا بالکل امر وجدانی ہے یعنی وہی امر ہے کہ تصور کیا جاوے کہ اگر بحکم حق میں ولد کو ذبح کر ڈالوں تو مجھپر کیا حالت گذرے سو ظاہر ہے کہ سخت ناگواری طبعی گذرے اور ایسی حالت میں اس فعل کو کر ڈالنا یہ اس ناگواری طبعی کو برداشت کر لینا ہو پس وہ امر جو گذرے وہ یہ ہوا کہ طبعی ناگواری شدید کو خدا کے حکم سے برداشت کرنا اور اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں فناء نفس کہتے ہیں پس روح ذبح الولد کی فناء نفس ٹھہرا پس یہی فناء نفس روح تضحیہ کی ہوئی پس معنی جملہ التضحیۃ ذبح الولد کے یہ ہوئے کہ روح التضحیۃ روح ذبح الولد پس حقیقت تضحیہ کی فناء نفس ہوا اور میں نے اسپر یہ حکم متفرع کیا تھا کہ جب روح اور حقیقت تضحیہ کی یہ ہے تو خود اس تضحیہ میں اور اس کے متعلق جمیع احکام و اعمال میں نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے بالکل احکام شرعیہ کا اتباع کیا جاوے واجبات میں لزوماً اور مستحبات میں بطریق محبت پس یہ حاصل تھا اس تقریر کا۔ اس تقریر سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ تقریر سنۃ ابراہیم سے تو قربانی کی حقیقت فناء نفس معلوم ہوتی ہے اور آج کی تقریر عود العید سے قربانی کی حقیقت تعظیم بالقلب معلوم ہوتی ہے جس کا ترجمان تکبیر باللسان ہے پس ان میں تدافع ہوتا ہے جواب یہ ہے کہ سنت ابراہیم میں حقیقت بمعنے ماہیت ہے چنانچہ حدیث میں حمل اس کی دلیل ہے اور عود العید میں حقیقت بمعنے غایت ہے چنانچہ قرآن میں لام کے لتکبروا اللہ اس کی دلیل ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں لفظ حقیقت کا اطلاق دونوں معنے میں شائع ہے اور اس اصطلاح پر دونوں تقریروں میں لفظ حقیقت وارد ہوگیا بس کچھ تدافع نہ رہا اور باوجود اس کے میں نے تقریر عود العید میں لفظ حقیقت کو بھی بچایا ہے اب ختم کرتا ہوں اور اس غایت پر بھی میں وہی احکام متفرع کرتا ہوں جو سنت ابراہیم میں حقیقت تضحیہ یعنی فناء نفس پر متفرع کئے تھے یعنی جب حکمت اس طاعت کی تکبیر بالقلب و باللسان ہے اور اس تکبیر کے لئے لازم ہے نفس کی تصغیر پس کبیر کے مقابلہ میں صغیر کا اتباع نہ کیا جاوے کبیر ہی کے احکام کو متبوع اصل قرار دیا جاوے خلاصہ یہ کہ ان احکام میں مثل جمیع احکام کے نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے پس ترجیح احکام النصوص علی احکام النفوس لازم عام ہے وعظ سنت ابراہیم کی حقیقت کے لئے اور وعظ عود العید کی غایت کے لئے سو اس طرح سے دونوں مضمونوں کی تفریعات بھی متماثل ہوگئیں بس دعا کیجئے اللہ تعالیٰ ہمکو فہم صحیح اور توفیق عمل نصیب فرماویں آمین فقط

تم وعظ عود العید